ڈاکٹر خاور نوازش*

سر سید احمد خان کی انگریز دوستی اور مسلم مفادات

(مابعد نو آبادیاتی تناظر میں)

Abstract: *Sir Syed Ahmad Khan(1817-1898) a great reformer and philosopher of nineteenth century has often been celebrated with both the positive and negative attitude regarding his loyalty to the British Government of India. He faced labels of an Anglophile Muslim Leader and Naturei whenever insisted to learn English language and adopt the new thoughts. It is beyond the pale that total number of Muslim graduates in India was only three (3) when Sir Syed laid down the foundation of Aligarh Madrissa. In that situation he was rightly of the opinion that Muslims should focus on improving their education first. His viewpoint that Muslims should maintain a distance from politics and avoid confrontation with British rulers especially when they were being considered as defiant or disloyal after 1857 was not wrong. Sir Syed Ahmad Khan remained the part of British Government and tried to make all his Aligarh fellows and students realize that they should try to go in civil service and join hands with the administration rather to be offensive. This was the only way to protect the rights of the Muslim nation. This article, in post colonial perspective, presents a deep study and analysis on this subject. Thesis comes out this paper is that Sir Syed's notion to stay in the system was very much considerable as this was the only right way to do something long-lasting for his nation.*

سر سید احمد خان کی سیاسی زندگی پر کوئی بھی بات کرنے سے پیشتر یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ کوئی انقلابی راہنما تھے نہ ہی کسی جنگِ آزادی کے ہیرو بلکہ ایک جنگ ہارے ہوئے لشکر کے لواحقین کے حیلہ ساز تھے۔ وہ بھگت سنگھ نہیں تھے اور نہ ہی باچا خان تھے بلکہ صوبیدار بخت خان ایسے باغی فوجیوں کی ناکامی کی ملامت کا بوجھ اُٹھانے والے کیمپ میں سے تھے۔ سر سید احمد خان انقلاب نہ بن سکنے والی بغاوت کے بعد کے سیاسی و معاشرتی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی قوم کے لیے باعزت زندگی کرنے کے راستے کے متلاشی تھے۔ انھیں یہ نکتہ سمجھ میں آ چکا تھا کہ اب بقا نظام کے اندر رہنے میں ہے، نظام سے باہر نکلنا یا رہنا رسوائی، مکمل غلامی اور بالآخر موت کی طرف لے جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سر سید احمد خان ہندوستان کے وہ پہلے مصلحِ قوم نہیں تھے جنھوں نے انگریزوں سے دوستی کی بات کی بلکہ

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان (پاکستان)۔

اُن سے بہت پہلے بنگال سے راجہ رام موہن رائے نے بر ہمو سماج کی ایک ایسی تحریک شروع کر دی تھی جسے بادی النظر میں ہندوستانیوں کی انگریز دوستی کا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں تعلیمی میدان میں اور انتظامی عہدوں پر پڑھے لکھے ہندوؤں کی اکثریت نظر آتی تھی۔ انگریزوں نے بنگال اور مدراس میں یوپی اور پنجاب سے بہت پہلے ایسے تعلیمی ادارے قائم کر دیے تھے جہاں ہندو طلبا جدید انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مغربی حکمرانوں کی بات اور سیاست کو سمجھ رہے تھے۔ ہندوؤں اور انگریزوں میں اجنبیت بھی کم ہو رہی تھی۔ اِدھر ۱۸۰۳ء میں دہلی پر کمپنی کے قبضے کے باوجود حالات ویسے نہ تھے۔ لوگوں کی اکثریت انگریز حاکمیت کو قبول کرنے کے لیے ابھی تک پوری طرح تیار نہ تھی۔ سر سید احمد خان خود بھی ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں نہ صرف مغلیہ حکومت کے وجود کو تسلیم کر رہے تھے بلکہ سید احمد شہید کی جہادی تحریک پر ایک مکمل باب بھی لکھا لیکن ۱۸۵۴ء میں جب آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا تو اس میں سے نہ صرف سید احمد شہید پر باب یکسر حذف کر دیا بلکہ ۱۸۰۳ء [جب کمپنی بہادر نے دہلی پر قبضہ کیا تھا] کو برطانوی حکومت کے آغاز کا سال بھی تسلیم کیا (۱)۔ ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ قبضہ اور بادشاہ کی گرفتاری سر سید احمد خان کے لیے اتنا تکلیف دہ واقعہ نہیں تھا جتنا بغاوت کے بعد ہندوستان میں خانہ جنگی اوراس کے نتائج میں اپنی قوم کی رسوائی۔ یوپی کے کچھ اشراف اور سر سید احمد خان ایسے متعدد سرکاری ملازمین حکومتِ انگلشیہ سے تنخواہ پاتے تھے سو اس لیے اُس کے وفادار بھی تھے۔ اٹھارہ سو ستاون اُسی تنخواہ خوار اور وفادار طبقے کے لیے سب سے زیادہ خوف اور دہشت ناک فضا لے کر آیا۔ ایک طرف انھیں باغیوں کی جانب سے ڈر تھا کہ وہ انھیں سرکاری ملازم سمجھ کر مار ڈالیں گے اور دوسری طرف سرکار کی جانب سے کہ وہ باغیوں کے ہمدرد ہونے کا شک کرے گی۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ وفا شعاری کا رشتہ ٹھیک اُسی لمحے نہیں جڑا جب غدر برپا تھا اور سر سید بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر کے خاندان کی حفاظت کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے تھے بلکہ ۱۸۳۹ء میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی مقرر ہونے کے وقت سے (۱۸۵۷ء تک) بجنور میں صدر امین ہونے تک سر سید سرکاری مشینری کا حصہ ہو چکے تھے اور انگریز افسروں کے ساتھ اعتماد کا گہرا رشتہ رکھتے تھے۔ غدر کے دنوں میں بھی سرکاری حکم نامے کے مطابق حتی المقدور ضلع بجنور کا انتظام سنبھالے رکھا۔ باغیوں سے جان بچا کر میرٹھ گئے تو پتا چلا کہ دِلی میں اُن کے خاندان پر فرنگیوں نے زمین تنگ کر دی ہے۔ دِلی گئے اور ایک ملازم کی کوٹھری میں کئی دنوں سے بھوکی پیاسی جان بچائے بیٹھیں اپنی والدہ اور خالہ کو ساتھ لے کر میرٹھ آ گئے۔ اُن کی والدہ کا کچھ عرصہ بعد بیماری اور ناتوانی کے باعث انتقال ہو گیا۔ سر سید کے لیے یہ دکھ بھی شاید اُس دکھ سے بڑا نہ تھا جو اپنی قوم کی حالت دیکھ کر اُنھیں ہو رہا تھا۔ لکھتے ہیں :

> ”غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا اور نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعد میں اس وفاداری کے صلہ میں جہاں آباد جو سادات کا ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلق دار بنوں۔“(۲)

اس انکار کے بعد جب اُن کی وفاداری اور ہمت کے عوض سرکار نے ترقی دے تو سرسید سے اسے قبول کر لیا۔ لکھتے ہیں :

> ”اس [وفاداری] کے عوض سرکار نے میری بڑی قدر دانی کی۔ عہدہ صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائیں اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپے کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدد خرچ کے مرحمت فرمایا۔“ (۳)

سرسید احمد خان نے ایک لاکھ روپے سے زائد مالیت کی جائیداد لینے سے انکار کر کے سرکاری عہدے پر ترقی کیوں قبول کی؟ غدر کے صدمے سے نڈھال اور غلاموں کی سی زندگی کے خوف میں انھوں نے ہندوستان چھوڑنے کا بھی سوچ لیا تھا پھر یکایک صدر الصدور بن کر سرکاری مشینری کا حصہ کیونکر بنے۔ سرسید احمد خان کے اس فیصلے کو سمجھنے کی خاص ضرورت ہے کیونکہ یہ بالکل سیاسی نوعیت کا فیصلہ تھا۔ دراصل انگریزوں کی نظر میں غدر کے واقعے کے ذمہ دار مسلمان اور بالخصوص وہ چند نوابین تھے جنھوں نے باغیوں کی مکمل معاونت کی ۔ انگریزوں کے شدید ردِ عمل اور بدسلوکی کا نشانہ بھی اب وہی بن رہے تھے۔ سرسید کے لیے اپنے اشراف کی ایسی رسوائی دیکھنا قابلِ برداشت نہ تھا اور پھر جب سبھی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا تھا تو یہ کھلی ناانصافی تھی۔ سرکار اُن سب مسلمانوں کو بھی باغی سمجھتی تھی جنھوں نے سرکار کے خلاف نہیں بلکہ غدر کے موقع پر شروع ہونے والی خانہ جنگی میں ہندوؤں سے لڑائی لڑی تھی۔ سرسید نے صورتحال میں اُس اعتماد کو سیاسی سطح پر استعمال کرنے کا سوچا جو انگریز حکام اُن پر کرتے تھے۔ مابعد نوآبادیاتی تناظر میں دیکھیں تو استعمارزدہ قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے استعمار کاروں کے ساتھ رشتے یا تعلق کا فائدہ اٹھانے کی سیاست ہی سرسید احمد خان کو اُس دور کا بڑا مفکر بنا کر سامنے لاتی ہے۔

اٹھارہ سو ستاون کے بعد مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور بغاوت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شریک تمام ہندوستانیوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ منضبطہ جائیدادوں کے حوالے سے عذرداریاں سننے کے لیے مختلف اضلاع میں کمیشنز تشکیل دیے گئے اور ہر کمیشن میں دو یورپی افسروں کے ساتھ ایک ہندوستانی ممبر کو بھی شامل کیا گیا۔ سرسید احمد خان ضلع مراد آباد کے کمیشن کے ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے اور ہندوستانیوں کی طرف بدگمان یورپی افسروں کو اعتدال میں رکھتے ہوئے بقول حالیؔ اتنی ضبط شدہ جائیدادیں واگزاشت کرائیں جتنی کہ پورے صوبہ شمال مغرب کے کسی اور ضلع میں نہ ہوئیں (۴)۔ انگریز دوستی کے تحت مسلم مفادات کے تحفظ کے سلسلے کی یہ سب سے پہلی کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ سرسید احمد خان کی اس اولین کامیابی نے اُن کو یقین دلا دیا کہ اب عزت کے ساتھ زندگی جینے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے سسٹم کے نہ صرف اندر رہنا ہو گا بلکہ تعلیمی ترقی کے ساتھ اسی سسٹم میں اپنے لیے معقول جگہ بنانا ہو گی۔ دریں اثنا بغاوت کے نتیجے میں حکمرانوں کی طرف سے آنے والے ردِ عمل کو کم کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے جو دیگر اقدام اٹھائے اُن میں ’تاریخ سرکشیٔ بجنور‘، ’رسالہ اسباب بغاوتِ ہند‘ اور ’رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا‘ کی تالیف بہت اہم ہیں۔ یہ تینوں تالیفات ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ سب سے زیادہ ہلچل اسباب بغاوتِ ہند پر پیدا ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۵۹ء میں پانچ سو کی تعداد میں چھپ کر آیا (۵) تو سرسید احمد خان نے صرف ایک کتاب گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی، چند جلدیں اپنے پاس رکھیں اور بقیہ

ولایت روانہ کر دیں۔ رسالہ اسباب بغاوتِ ہند سر سید احمد خان نے ہندوستانیوں کے لیے کبھی بھی پبلک نہ کیا۔ بقول حالیؔ ۱۸۷۳ء میں پہلی دفعہ اسے کسی مدبر حاکم نے ترجمہ کر کے شائع کرایا تب لوگوں نے اسے پڑھا۔ ۱۸۵۹ء میں سر سید احمد خان کا گورنمنٹ کو بھیجا گیا رسالہ ' اسباب بغاوتِ ہند ' جب ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوا تو سنجیدگی سے لیا گیا۔ سر سید احمد خان نے اس میں سرکشی کے معنی سے لے کر اسباب اور نتائج تک سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلا نکتہ جو اس رسالے میں اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ بغاوت کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ مسلمانوں میں تو اب بھی انگریزوں کے خیر خواہان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور دوسرا نکتہ جو زیادہ اہم اور بنیادی ہے وہ یہ اٹھایا گیا کہ جب تک حاکم کا اپنی رعایا سے براہِ راست رابطہ استوار نہیں ہوگا اُس وقت تک دونوں میں فاصلہ برقرار رہے گا جس سے کوئی بھی نہایت آسانی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور یہ فاصلہ تبھی مٹ سکتا ہے جب ہندوستان کے معاملات میں ہندوستانیوں اہم سمجھا جائے اور شریک کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> ''سر سید احمد خان نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی کتابوں ۔۔۔ میں جس نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا تھا وہ وہی تھا جو امریکا میں برطانوی حکومت کے لیے گلے کے ہڈی بن گیا تھا۔ یعنی اسٹامپ ڈیوٹی (Stamp Duty) کے خلاف امریکیوں کی بغاوت اس وجہ سے شروع ہوئی کہ امریکی چاہتے تھے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں نمائندگی کے حق کے بغیر ان پر ٹیکس لگانا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ سر سید نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال پر واضح کیا کہ ہندوستانیوں کو ہندوستان کے معاملات میں حصہ لینے کا حق ہونا چاہیے۔ سر سید نے اپنی تصنیف رسالہ ' اسباب بغاوتِ ہند ' میں اسی نکتہ پر زور دیا اور وہ پہلے ہندوستانی راہنما تھے جنھوں نے برطانوی عمل داری کے خلاف یہ قانونی اور آئینی نکتہ اٹھایا تھا۔''(۶)

سر سید احمد خان کی بین الاقوامی سیاست پر اُس دور میں بھی اتنی گہری نظر تھی کہ وہ دنیا کی مختلف نو آبادیوں کے حالات اور تحریکوں سے واقف تھے۔ رسالہ اسباب بغاوتِ ہند کے بالکل آخر میں ہندوستان میں اسٹامپ کے جاری ہونے پر امریکا کی بہ نسبت مختلف وجوہ بیان کر کے اعتراض بھی کیا ہے گویا ہندوستانیوں کی دوسری نو آبادیوں کے حالات سے آگہی کا اشارہ بھی دیا ہے۔ اس رسالے کا جس بھی زاویے سے جائزہ لیا جائے سر سید احمد خان کو داد دینا پڑے گی کہ ہر زاویے وہ سرکار کو ہی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اس رسالے کو حکومت کے بیشتر لوگوں اور برطانوی اخبارات نے سر سید کی انگریز سرکار سے وفاداری قرار دیتے ہوئے اس کے نکات پر سنجیدگی سے توجہ دینے کا مطالبہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے ہی سال ۱۸۶۱ء میں لیجسلیٹو کونسل کے لیے تین ہندوستانی رئیس نامزد ہوئے جن میں پٹیالہ سے مہاراجہ نرندر سنگھ، بنارس سے راجہ دیو نرائن سنگھ اور گوالیار سے راجہ ڈنکر راؤ دیوان شامل تھے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کو بڑے سرکاری عہدوں پر مقرر نہ کرنے کی شکایت کا ازالہ کرتے ہوئے ۱۸۶۲ء میں پہلی بار کلکتہ ہائی کورٹ کے جج پنڈت شمبو ناتھ مقرر کیے گئے (۷)۔ سر سید کی طرف سے بوئے گئے بیج کو پودا بنتے ہوئے دیر نہ لگی اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے اعلیٰ عہدوں پر بھی

ہندوستانیوں کی تعیناتی کا سلسلہ چل نکلا۔ رسالہ ’ اسباب بغاوتِ ہند ‘کا برطانوی پارلیمان کے ارکان تک پہنچنا سرسید احمد خان کا ایسا شاندار کارنامہ تھا جس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقدمہ کمزور پڑ گیا اور یوں ایک نئے ہندوستان کا چہرا ابھرنے لگا۔ اس رسالے کے ساتھ ہی دوسرا اہم رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا ہے جس میں سرسید نے دراصل استعمار کار اور استعمار زدہ کے درمیان اُس طبقۂ اشرافیہ کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے جو غدر میں انگریز سرکار کا وفاشعار رہا۔ بائیس خیر خواہان کی اس رسالے کے ذریعے نشاندہی کی گئی تاکہ ایک طرف تو سرکار کو یہ یقین دلایا جاسکے کہ پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور دوسری طرف کچھ ایسے پڑھے لکھے وفاشعار مسلمان رئیسوں کی فہرست بھی پیش کی جا سکے جن میں سے کسی نہ کسی کی لیجسلیٹو کونسل کے لیے بھی نامزدگی ہو سکتی ہو اور جن کو اگر سرکار نوازتی رہے تو وہ اس کے اقتدار کے محافظ ہوں گے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ابتدائی پانچ سات برس سرسید احمد خان نے اپنی تحریروں میں باغیوں کو کوسنے اور نمک حرام کہنے کے ساتھ ساتھ وفاداروں کی تعریفوں میں بھرپور توانائی صرف کی۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو عیسائی حکمرانوں کے قریب لانے کے لیے مذہب کا بھی سہارا لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہبی آئیڈیالوجی سب سے زیادہ موثر ہتھیار ہو سکتا ہے۔ ’تبئین الکلام‘ اسی غرض سے لکھی اور اس میں دونوں مذاہب کی قربتوں کو موضوع بنایا گیا۔ سرسید کے اکثر ناقدین سمجھتے ہیں کہ وہ شروع سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے یہ تو ورناکیولر یونیورسٹی کے قیام کے حوالے سے اُردو اور ہندی کا لسانی جھگڑا کھڑا ہوا تو سرسید قومیت کی مذہب اساس توجیہہ و تعریف کی طرف آ گئے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اس دور کی مجموعی سیاسی صورتِ حال کو مابعد نو آبادیاتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں تو سرسید کا مرکزِ نگاہ صرف مسلمان نظر آتا ہے، وہ نو آبادیاتی نفسیاتی جبر کے زیرِ اثر جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ مسلمانوں کے مستقبل کو ذہن میں رکھ کر ہی کر رہے تھے۔ یہ ممکن نہیں کہ سرسید جیسا وسیع النظر آدمی صرف لسانی اختلاف پر یہ فیصلہ کر لے کہ اب دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ وہ ہندوستان کی مجموعی تعلیمی صورتحال سے پوری طرح آگاہ تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلیمی موازنہ بھی اُن کے لیے پریشان کن ہو گا۔ مجلسِ قانون ساز میں اور بڑے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کا براجمان ہونا بھی یقیناً سرسید نے ذہنی طور پر بآسانی قبول نہیں کیا ہو گا۔ سرسید نے اگر مختلف مواقع پر ہندو مسلمان کے بھائی بھائی ہونے کی بات کی ہے تو یہ بھی نو آبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے خوف کے زیرِ اثر کی ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ میری خواہش ہے کہ ہندو مسلمان اس طرح سے اکٹھے ہو جائیں کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے نہ جائیں کو متذکرہ سیاق میں دیکھنا اور سوچنا چاہیے کہ کیا اُس وقت مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ انگریزوں کی نفرت اور ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی تصادم کی حالت پیدا کر لیں۔ سرسید احمد خان نے لائل محمڈنز آف انڈیا لکھی تو بعد میں انھیں خیال آیا کہ صرف مسلمان اکیلے تو خیر خواہانِ حکومتِ انگلشیہ میں نہیں تھے بلکہ کچھ ہندو رئیس بھی تھے سو اُن کے بارے میں بھی لکھا جانا چاہیے۔ سرسید احمد خان نے جب جب ہندوؤں کو سول سروس کے امتحان میں پاس ہو کر سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے دیکھا ایک ہی وقت میں خوش بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ اگر وہ متحدہ قومیت کے مکمل طور پر قائل ہوتے تو لاشعوری سطح پر ہندوؤں کے آگے آنے سے پریشان نہ ہوتے۔ انھیں مسلم مفادات کو ہر صورت محفوظ بنانا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں، سول سروس میں آئیں، فیصلہ کن قوتوں تک رسائی حاصل کریں اور قانون سازی میں شامل ہو سکیں۔

۱۸۶۳ء تک مراد آباد میں رہ کر سر سید نے جتنے بھی کام کیے وہ مسلمانوں اور عیسائی حکمرانوں کے درمیان فاصلہ کم کرنے میں خاصے معاون ہوئے۔ اس کے بعد اُن کا تبادلہ غازی پور ہوا جہاں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور ایک وکٹوریہ اسکول قائم کیا۔ یہاں سے ایک برس بعد اُن کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور سائنٹفک سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہو گئی۔ یہاں اس سوسائٹی کو انگریز حکام کی مکمل سرپرستی حاصل ہوئی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا جس نے ہندوستانیوں کی سیاسی تربیت کرنے اور حکام اور رعایا کو قریب لانے کی کوششیں کیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

> ”اول اول سر سید زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔۔۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ “(۸)

علی گڑھ میں چار سال قیام کے دوران ایک برٹش انڈین سوسائٹی کی بھی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد انگریز حکام اور مقامی اشرافیہ کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع دینا تھا۔ سر سید نے اسی ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے صوبہ شمال مغرب کے گورنر اور وائسرائے کے نام خط میں اُس ورنا کیولر یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھجوائی جو قائم تو نہ ہو سکی لیکن ہندی اُردو قضیے کی تحریک ضرور بن گئی۔ علی گڑھ سے ترقی پا کر سر سید بنارس گئے جو ہندو قوم پرستوں کا گڑھ تھا۔ وہاں ابتدائی دو برس قیام کے بعد ہی سر سید کے لاشعور میں موجود مسلمانوں اور ہندوؤں کا تہذیبی تفاوت شدید ہونے لگا اور ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کی خواہش مندانہ فکر بھی تحلیل ہونے لگی۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور وہاں کی علمی و مادی ترقی کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ انگریزوں پر یہ الزام لگانا غلط ہے کہ وہ ہندوستان کے مقامی باشندوں کو جانور سمجھتے ہیں اصل یہ ہے کہ ہم درحقیقت جانور ہی ہیں۔ سر سید احمد خان کی یہ سوچ اُس شدید دکھ کا اظہار ہے جو انھیں اپنی قوم کی تعلیمی حالت کی طرف دیکھ کر ہوتا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں جب الفریڈ کرافٹ کی تعلیمی رپورٹ شائع ہوئی تو پورے ہندوستان میں مسلمان گریجویٹ کی تعداد بیس(20) تھی جن میں سے سترہ (17) بی اے اور تین (3) ایم تھے(۹)۔ [بیس برس بعد علی گڑھ کے بنیادی کردار کی وجہ سے جب مسلمان گریجویٹس کی تعداد 3 سے 313 تک پہنچی تو پورے ہندوستان میں ہندو گریجویٹس کی کل تعداد 6081 تھی]۔ یہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب سر سید اپنی قوم کی جہالت پر دکھ کا اظہار کر رہے تھے تب تو یہ تعداد اور بھی کم ہو گی۔ انگلستان سے واپس آ کر سر سید احمد خان چھ برس بنارس میں رہے۔ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس میں معاشرتی زندگی کے ہر موضوع پر اصلاحی مضامین لکھے۔ اب وہ دل و جان سے اپنی قوم کی اصلاح میں لگ چکے تھے، تہذیب الاخلاق کے مضامین کی شدید مخالفت ہوئی، سر سید پر فتاویٰ جاری ہوئے لیکن انھوں نے کسی بات کی پروا نہیں کی۔ انگریزی زبان اور سائنسی علوم سیکھنے کے ایمان کی حد تک قائل تھے انھوں نے واشگاف لفظوں میں کہا کہ جدید علوم کی ضرورت اس لیے نہیں کہ یہ ہمیں نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنی ذات کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں بلکہ ان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ غلاموں کی ترقی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے علوم و زبان پر دسترس حاصل کریں(۱۰)۔ مختلف لیکچروں میں انھوں نے کہا کہ:(۱۱)

- ہندوستانیوں کو اس درجہ تعلیم دی جائے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جاوے۔
- ہائی ایجوکیشن ہمارے اندر وہ اعتماد اور صلاحیت پیدا کر دے گی کہ ہم جو چاہیں گے حکومت کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔
- وہ دن دُور نہیں کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہو گا۔ وہ دن آوے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔

۱۸۷۲ء میں سر سید نے ایک کمیٹی ' خواستگارِ ترقیِ تعلیمِ مسلمانان ' تشکیل دی جس کے ذمے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی طرف رجحان کی کمی کی وجوہات اور حل کے لیے تجاویز دینا تھا۔ اس کمیٹی نے طریقِ تعلیم پر کچھ تجاویز کے ساتھ ایک کالج کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔ سر سید احمد خان نے کمیٹی کی رپورٹ حکامِ بالا کو بھجوائی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی اسکیم سر سید کے بیٹے سید محمود نے ولایت کے مختلف تعلیمی اداروں کا دورہ کر کے تیار کی۔ حکومتی تائید حاصل ہونے کے بعد کالج کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنے پر بھی سر سید کو بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں سر سید کی انگریز دوست پالیسی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شمال مغربی اضلاع کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان سٹر یچی کی مہربانی سے ابتدائی سطح کے ایک مدرسہ کے لیے علی گڑھ میں کچھ زمین مل گئی اور ۲۴؍ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرستہ العلوم کا افتتاح (۱۲) سر سید نے اپنے مخالف ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم کے ہاتھوں کرایا۔ ۱۸۷۶ء میں سر سید ریٹائر ہو کر بنارس سے مستقل طور پر علی گڑھ آ گئے اور اس سکول کو کالج کا درجہ دلانے کی کوششیں شروع کیں۔ یہاں پھر انگریز سرکار سے دوستی کی پالیسی کام آئی کہ اپنے قیام کے فقط دو سال بعد ۱۸۷۷ء میں مدرستہ العلوم کو ایم اے او کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے اس کالج کا افتتاح کیا اور یہی وہ کالج تھا جو ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس کالج کے قیام کا مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر جو اثر ہوا اُس کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں مسلمان ہندوستان کی کل آبادی کا 23.25 فیصد تھے اور ان میں گریجویٹ مسلمانوں کی تعداد 31 تھی۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۷ء کے پانچ سالوں میں مسلمان گویجویٹس کی تعداد 154 پھر ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۳ء کے درمیان یہ تعداد بڑھ کر 313 ہو گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ تعداد 313 ہوئی تو ہندوستان بھر میں ہندو گریجویٹس کی تعداد 6081 تھی۔ بہر کیف ایم او کالج مسلمانوں کا واحد بڑا ادارہ تھا جہاں جدید مغربی علوم کی تعلیم دی جا رہی تھی اور اس نے کافی حد تک deliver کرنا شروع کر دیا تھا۔ سر سید احمد خان نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کر کے مسلمانوں نوجوانوں کو سول سروس کے امتحان کے لیے ولایت بھجوانے کا چندہ جمع کیا۔ نوجوانوں کو تیاری بھی کرائی گئی لیکن کوئی اس امر کے لیے ولایت جانے پر تیار نہ ہوا۔

۱۸۷۸ء میں سر سید احمد خان کی وفا شعاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کو انگریز سرکار نے انھیں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب کیا۔ کونسل میں رِہ کر سر سید نے مسلمانوں قاضیوں کی ملازمتوں کے لیے ایک ایسا بل منظور کرایا جس کے تحت گورنمنٹ نے مسلمانوں کے کچھ مذہبی معاملات کے حل کے لیے قاضیوں کے سرکاری تقرر کی منظوری دی۔ ایک اور بل انھوں نے مسلم اشرافیہ کی

جائیدادوں کو ناقابلِ فروخت ناقابلِ تقسیم در تقسیم بنانے کے لیے پیش کرنا چاہا لیکن وہ قانونی پیچیدگیوں کی نذر ہو گیا۔ سر سید خود تو جاگیر دار یا نواب نہ تھا لیکن اپنی قوم کے نوابین کو ہمیشہ اُسی شان و شوکت کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تجویز قابلِ عمل نہ تھی۔

۱۸۸۵ء میں مسٹر ہیوم کی تجویز پر لارڈ ڈفرن نے ممبئی میں کلکتہ یونیورسٹی کے سابق گریجویٹس کو ضیافت پر بلایا جہاں ‘انڈین یونین’ کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنا تھی تاکہ معاصر مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ ہو سکے۔ 175 افراد کی اس ضیافت کو ہی نیشنل کانگرس کے پہلے اجلاس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس اجتماع میں ایلیٹ کلاس ہندوستانی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے شرکا نے بحث و مباحثہ کے بعد دو تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ سول سروس کا امتحان انگلستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ہو اور دوسری یہ تھی کہ مقامی کونسلوں میں نامزدگی کی بجائے انتخابات کے ذریعے ممبر منتخب کیے جائیں(۱۳)۔ سر سید احمد خان ہمیشہ سے ہندوستانیوں کے سیاسی معاملات میں مداخلت کے خلاف تھے بالخصوص مسلمانوں کے عملی سیاست میں دلچسپی لینے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت ابھی ایسی نہیں کہ وہ قومی معاملات میں دلچسپی بھی لیں۔ سر سید کے ذہن میں یقیناً مسلمان قوم کے گریجویٹ کی وہ تعداد ہو گی جو چند سو پر مشتمل تھی اور اتنی سی تعداد کے ساتھ ملکی معاملات میں دخل اندازی سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنا ہی تھا لیکن کچھ مورخین نے اسے کانگرس مخالف جماعت سمجھا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ سر سید نے اس کے اجلاسوں میں مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے اور خاص طور پر کانگرس میں شمولیت سے بھی منع کیا۔ ۱۸۸۷ء میں جب کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں منعقد ہو رہا تھا تب سر سید نے ایجوکیشنل کانگرس کا اجلاس لکھنو میں طلب کیا اور اپنی تقریر میں واشگاف الفاظ میں مقامی کونسلوں کے انتخاب کے لیے جمہوری طریقہ اختیار کرنے اور سول سروس کا امتحان ہندوستان میں لینے کی سخت مخالفت کی۔ اُن کا ٹھیک خیال تھا کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے نہ تو جمہوری انتخاب کے ذریعے کبھی کونسلوں میں جا سکیں گے اور نہ سول سروس میں کوٹا سسٹم ختم ہونے سے سلیکٹ ہو سکیں گے۔ ۱۸۸۸ء میں شمالی ہند کے اُردو ہندی کے جھگڑے پر لڑنے والے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ایک سیاسی تنظیم یونائیڈ انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی قائم کی سر سید اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس تنظیم نے بھی کانگرس کی سول سروس کے امتحان کے حوالے سے تجویز کی سخت مخالفت کی۔ سر سید تمام عمر انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی پر کاربند رہے لیکن جہاں کہیں مسلم مفادات کی بات آئی وہاں ڈٹ کر مخالفت کی۔ پروفیسر افتخار عالم نے ۱۸۷۶ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مختلف پرچوں کے مضامین کو بنیاد بنا کر بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سر سید کے انگریزوں سے لائل ازم یا وفاشعاری کے نظریے سے خوشامد یا مداح خوانہ رویے کی طرف دھیان نہیں جانا چاہیے(۱۴)۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع کے کچھ برسوں میں مثلاً مناجات وغیرہ کے موقع پر سر سید کا مدح خوانہ رویہ ضرور نظر آ سکتا ہے لیکن یورپ سے واپسی کے بعد سر سید احمد خان نے جو مضامین لکھے اُن میں انگریز سرکار پر تنقید بھی نظر آتی ہے اور اُن کی غلط پالیسیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ سر سید کی انگریز دوست پالیسی کے بنیادی مقاصد میں سے پہلا اپنی قوم کے اجتماعی لاشعور سے انگریز دشمنی کا عنصر نکالنا تھا جس میں وہ مکمل کامیاب ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے لیکن یہ ضرور کر گئے کہ زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اپنے حقوق کی پہچان اور اُن کے حصول کے لیے

لڑائی کا قانونی طریقہ بتااور سکھا گئے۔ دوسری طرف اس پالیسی کے ذریعے انگریز حکام کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ مقامی باشندوں کو کارِ سرکار میں شامل رکھنا ہی اُن کی حاکمیت بر قرار رکھ سکتا ہے۔ یہ سر سید کے پختہ سیاسی شعور کا ہی نتیجہ تھا کہ بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

> ”سر سید احمد خان نے انگریز حکومت کے ساتھ وفاداری کا پورا فائدہ اٹھایا۔ علی گڑھ چھاؤنی کا وسیع و عریض رقبہ حاصل کیا۔ انڈین کونسلز ایکٹ میں نامزدگی کے حق میں ترمیم کروائی اور ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی رُو سے مرکزی اسمبلی کے ۲۴ اراکان میں ۱۴ سرکاری اراکان، ۵ نامزد اراکان اور ۴ منتخب اراکان کی تعداد مقرر کروانے میں بھی کافی دوڑ دھوپ کی۔ سر سید احمد خان نے در حقیقت مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو تسلیم کروایا۔ سر سید احمد خان نے ۱۸۶۱ء سے لے کر ۱۸۹۲ء تک کی آئینی ترقی میں اپنی تقریروں اور خطوط کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تعلیم کے فرق سے خود ثقافتی اسباب کی بنا پر لوکل باڈیز اور پھر صوبائی اور مرکزی اسمبلی میں نامزدگیوں کے لیے مسلمانوں کو علیحدہ سے نامزد کیے جانے کے اصول کو تسلیم کرواکے اپنے انتقال کے بعد منٹو مارلو اصلاحات (۱۹۰۹ء) میں جداگانہ انتخابات کے اصول کی بنیاد فراہم کی۔“(۱۵)

فطری طور پر ہر انسان آزادی کا خواہاں ہے، کوئی بھی غلام نہیں رہنا چاہتا۔ سر سید کے اندر غلامی ہی ایک خوف ہے جو اُس سے سب کچھ کروا رہی تھی۔ انھوں نے جب کہا کہ غلاموں کی ترقی کا راز اسی میں ہے کہ آقاؤں کی زبان اور علوم سیکھے تو دراصل غلامی سے نکلنے کا راستہ دکھایا۔ سر سید احمد خان کی انگریز دوستی کے سیاق میں سے اگر نو آبادیاتی نظام کے نفسیاتی جبر کو نکال دیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ مورخ انھیں اپنی قوم اور ملک کا غدار لکھے اور انگریز دوست کی بجائے سامراج دوست لکھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے مجموعی سیاسی حالات بالخصوص مسلمانوں کی طرف تاجِ برطانیہ کے رویہ اور جذباتی مسلم علما و فقہا کے جہادی افکار اور ترغیبات اگر سیاق میں موجود نہ ہوں تو سر سید کے مذہبی خیالات اور مطابقت پسندی کی بھی ہر تعبیر ادھوری ہو گی۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے اور بالخصوص انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے سر سید نے جو انتھک جدوجہد کی اُس کا مقصد واقعتاً ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو انگریزوں کی سیاسی مشینری کا حصہ بن سکے۔ اِس عمل کو سر سید کی طرف سے ’کالے انگریز‘ پیدا کرنے کی تحریک کہنا بالکل بجا ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ عمل اقتدار کا حصہ بننے کا عمل تھا اور اس کے بغیر مسلم مفادات کا تحفظ ناممکن تھا۔ سر سید جانتے تھے کہ کسی کونسل میں یا کمیشن میں اگر انگریزوں کے علاوہ صرف ہندو ممبران بیٹھیں گے تو مسلم مفادات کو شدید خطرہ ہو گا۔ کسی بھی نظام سے باہر نکلنا خاص طور پر اُس وقت جب آپ کے باہر نکلنے سے نظام کو کوئی خاص فرق بھی نہ پڑے، سیاسی اعتبار سے جہالت تصور ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے غور کریں تو آزادئ ہند کی پوری تحریک کو انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے ہی کامیابی سے ہم کنار کیا۔ محمد علی جناح ہو یا جواہر لال نہرو، یہ لوگ سر سید احمد خان کی ہی سیاسی فکر کا عملی تسلسل سمجھے جاتے ہیں نہ کہ اکبر الہٰ آبادی کی یا بال گنگا دھر تلک کی۔ گو کہ اپنی وفات تک سر سید نے ہندوستان کی انگریزوں سے

آزادی پر کوئی بات نہیں کی تھی لیکن پوری زندگی کی جدوجہد اور فیصلوں سے مستقبل کے راہنماؤں کے لیے یہ اہم پیغام ضرور چھوڑ گئے کہ اپنی قوم کو آزادی کی صبح تک لے جانے کے لیے جس مسلسل سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہوتہ ہے وہ سسٹم کے اندر رہنے سے ہی ممکن ہے سسٹم سے باہر نکل کر کسی طرح کی بغاوت سے آپ ہیرو تو بن سکتے ہیں لیکن قومی راہنما نہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور جدت پسندی، پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، اشاعت سوم، ص ۴۷

۲۔ سر سید احمد خان کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری، مرتبہ: منشی محمد سراج الدین کشمیری بازار لاہور، ۱۸۹۰ء، ص ۴

۳۔ مقالاتِ سر سید، جلد ۷، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۴۸

۴۔ حالیؔ، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، اکادمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۶۔ سر سید احمد خان اور جدت پسندی، ص ۴۶

۷۔ حیاتِ جاوید، ص ۳۹۰

۸۔ حیاتِ جاوید، ص ۱۸۴

۹۔ اختر الواسع، پروفیسر، سر سید کی تعلیمی تحریک، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، بار دوم، ص ۲۲

۱۰۔ مقالاتِ سر سید، جلد ۸، ص ۳۶

۱۱۔ بحوالہ: سر سید احمد خان اور اُن کا عہد از ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۱۔۳۰۲

۱۲۔ سر سید کی تعلیمی تحریک، ص ۲۹

۱۳۔ افتخار عالم خاں، پروفیسر، سر سید اور جدیدیت، سونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳۰۔۲۳۱

۱۴۔ ایضاً، ۲۰۹

۱۵۔ سر سید احمد خان اور جدت پسندی، ص ۴۹

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سائرہ بتول*

سر سیّد کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

Abstract: *Post-colonial study of Sir Syed Ahmad Khan's educational ideologies is categorically the study of weight and value of Sir Syed Ahmad Khan's movement and its impact on the Muslims of subcontinent. Sir Syed Ahmad Khan was of the view that British rule will never end, hence Muslims of India must choose their path to survive unlike the Muslims of Spain. He was well aware of the strategies of British government about Indian Muslims, that is why he decided to save their identity from being demolished. In order for making them the best obedient citizens of British government he established unique, quick and sophisticated ways of educating Muslims. However, if that is the case a big unanswered question comes to the mind that what if British rule ever ends? What, then, could possibly be the shape and structure of his ideologies? How Muslims will cope with the new post-colonial situation of the territory especially in case of their own independent state. Study suggests that Sir Syed Ahmad Khan's educational ideologies were transformed into some unexpected legacies and went absurd. However, his scholastic approaches and modern thoughts were silently transferred to a few modern Muslim thinkers and then to some of the future Pakistani generations.*

سر سید کا زمانہ نو آبادیات کا زمانہ ہے۔ مابعد نو آبادیات کا زمانہ ظاہر ہے اُس کے بعد والا زمانہ ہے۔ جہاں نو آبادیات کو استعماریت کہا جاتا ہے وہاں مابعد نو آبادیات کو لا محالہ مابعد استعماریت ہی کہا جائے گا۔ یعنی استعماریت سے چھٹکارے کا دور۔ یہ کون سا دور ہے؟ دراصل استعماریت کا آغاز اگر ہیلن آف ٹرائے سے ہوتا ہے تو مابعد استعماریت کا آغاز یقیناً اس وقت کو کہا جائے گا جب دنیا سے کشور کشائی کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔ غالباً یہ دوسری جنگِ عظیم ہے جس کے بعد سے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک پر ہمیشہ کے لیے زمینی قبضہ نہیں کیا، بلکہ پر انے قبضوں میں سے بھی اکثر ایک ایک کر کے چھوڑ دیے گئے۔ چنانچہ مابعد نو آبادیات کا صحیح آغاز تو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مابعد نو آبادیات کے عہد میں سر سید کے تعلیمی نظریات کے اثرات کیونکر اور کیا مرتب ہوئے؟ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ سر سید کے تعلیمی نظریات فقط برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے پر مشتمل ہیں تو ہم مابعد نو آبادیاتی عہد میں

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو (خواتین)، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔